TAMSAAL
تمثال
Vol 1, Issue 1 Jan-Jun,2022
www.tamsaal.pk tamsaalurdu@gmail.com

بشریٰ حمید
اسکالر ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

بانو قدسیہ کے ناولوں میں تہذیبی انہدام

Bushra Hameed
Scholar MPhil Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad

Civilization Destruction In The Novels Of Bano Qudsia

Bano Qudsia's three novels, "Umar Beysal", "Raja Gadh" and "Hasil Ghat" were discussed regarding the defeat of values. In the context of these three novels, an attempt has been made to understand the importance of values, their effects on the individual and the society, the situation of conflicting values, broken values and the ideas of Bano Qudsia about the individual and the society devoid of values. It is clear from the research study that Bano Qudsia recognizes the importance of values Also, each social group has specific values. People belonging to this group accept these values consciously and unconsciously and make it a part of their nature. Small social groups within a larger society exist on the basis of language, ethnicity and class. When the members of these social groups go out of their circle and scope, their values clash with other groups. Sometimes it has negative effects and sometimes it brings positive results.

Keywords: Bano Qudsia's, Novel, nature, consciously

اقدار کی شکست وریخت کے حوالے سے بانو قدسیہ کے تینوں ناول" عمر بے مثال " راجہ گدھ اور حاصل گھاٹ زیر بحث لائے گئے۔ ان تینوں ناولوں کے تناظر میں اقدار کی اہمیت، فرد اور معاشرے پر ان کے اثرات، تصادم قدر کی صورتِ حال، شکستہ قدروں اور قدروں سے عاری فرد اور معاشرے کے بارے میں بانو قدسیہ کے نظریات کو جانے کی کوشش کی گئی ہے۔تینوں ناولوں کے تحقیقی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بانو قدسیہ اقدار کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہیں اور بھتی ہیں کہ ہر معاشرتی گروہ مخصوص اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد ان اقدار کو شعوری اور لاشعوری طور پر تسلیم کر کے اسے اپنی فطرت کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ ایک بڑے معاشرے کے اندر چھوٹے چھوٹے معاشرتی گروہ لسانی، نسلی اور طبقاتی بنیادوں پر وجود میں آتے ہیں۔ ان معاشرتی گروہ کے افراد جب اپنے حلقے اور دائرہ کار سے باہر نکلتے ہیں تو دوسرے گروہوں کے ساتھ ان کی اقدار ٹکراتی ہیں۔ بعض دفعہ یہ منفی اثرات کا حامل ہوتا ہے اور کبھی یہ کراؤ مثبت نتائج لے کرآتا ہے۔

دیہات اور شہر کا ماحول بھی الگ الگ اقدار و رسم و رواج کو ترویج دیتا ہے۔ دیہات میں پرورش پانے والا فطری طور پر شہری سے مختلف رویوں اور رُجحانات کا اظہار کرتا ہے۔ شہر بے مثال میں بانو قدسیہ نے ایسے ہی دو معاشرتی گروہوں کی اقدار کے تصادم کو موضوع بنایا ہے۔ دیہات کی فطری سادگی ، معصومیت اور تحیر جب شہر کی جدت، ذہانت اور ہوشیاری سے ٹکراتا ہے تو ترقی کی خواہش میں دیہات سے آئے ہوئے افراد کے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ جدید معاشرے کی شہری اقدار انہیں احساس دلاتی ہیں کہ ان کی اقتدار فرسودہ اور ناکارہ ہیں۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے پرانے نظام اقدار پر ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔

حاصل گھاٹ میں بھی بانو قدسیہ کم و بیش یہی نظریہ پیش کرتی ہیں کہ ہر ملک اور معاشرہ اپنی تہذیبی واخلاقی اقدار کا سرمایہ رکھتا ہے۔ جب تک کوئی فرد اپنے ملک میں اپنی اقدار و ثقافت کے ساتھ رہتا ہے، وہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ اپنا ملک چھوڑ کر ترقی یافتہ ملک کا رُخ کرتا ہے تو وہاں کی مادی ترقی اسے انگشت بدنداں کر دیتی ہے۔

اسے اپنا معاشرتی نظام، رہن سہن، اقدار وروایات سب فرسودہ اور ترقی کی دشمن نظر آنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک کر کے اپنی شناخت کے یہ تمام عناصر کھو دیتا ہے۔بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ ہر معاشرتی گروہ اور تہذیب کا اپنا تشخص ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی اقدار کو چھوڑ کر دوسرے نظامِ اقدار کو اپنا تا ہے تو وہ اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ تہذیبی شناخت کا گم ہو جانا قوم کے لیے نفسیاتی وروحانی اور بقا کے مسائل کا باعث بنتا ہے۔ شہر بے مثال اور حاصل گھاٹ میں بانو قدسیہ یہی خیال پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شہر بے مثال میں ایک فرد ہجرت کے عمل سے گزر کر دیہات سے شہر کی جانب آتا ہے اور اپنی اقدار وروایات اس کی نظروں میں فرسودہ ہو جاتی ہیں، جبکہ حاصل گھاٹ میں پورا مشرقی معاشرہ ہجرت کے عمل سے گزرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہاں بانو قدسیہ مشرقی سوچ کا مغربی طرزِفکر میں ضم ہونے کا المیہ بیان کرتی ہیں :

آج امریکہ کی جدیدیت ہی سارے پرانے کلچروں کو کھا گئی۔ امریکہ کی ہسٹری ان کی سڑکیں اور بازار ہیں۔ ان کی امریکن زبان ساری زبانوں کو اکھاڑے میں پچھاڑ چکی ہے۔ حتی کہ جو انگریزی انگریزوں کی دستار تھی، وہ بھی اسے اتار کر امریکنوں کے قدموں میں رکھ چکے ہیں ۔ (1)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مشرق نے مغرب میں ضم ہونے کی جو کوششیں شروع کر رکھی ہیں ، ان کا انجام اندوہناک ہو گا۔ مشرق اور مغرب کا تضاد دراصل اقدار کا تضاد ہے۔ وہ کہتی ہیں :

مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں، استواری کا دلدادہ ہے۔ مشرق میں خواہش کو دبانے کا عمل ہے، مغرب میں ابھارنے کا ..... یہاں عقیدہ اہم ہے اور وہاں قاعدہ ... دونوں میں فرق اتنازیادہ ہے کہ یہ دونوں راضی نامہ نہیں لکھ سکتے ....اور اگر کبھی مشرق نے مغرب کی سوچ میں ضم ہونے کی کوشش بھی کی تو اس کو مذہب سے ہاتھ دھو کر فلاح کا راستہ چھوڑ کر یہ منزل مل سکے گی پھر شرمندگی، احساس گناہ، بے حیائی کا نیا سفر ہو گا اور مشرقی لوگ ، (2)

ان دونوں ناولوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بانو قدسیہ بجھتی ہیں کہ شخصی اور قومی تشخص کا انحصار اقدار پر ہے۔ تہذیبی و ثقافتی اور اخلاقی و مذہبی اقدار ہی کسی شخص، قوم اور معاشرے کی شناخت ہوا کرتی ہیں۔ اگر وہ ان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں تو نہ صرف شخص بلکہ پورا معاشرہ اپنا قومی تشخص کھو بیٹھتا ہے۔بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مادی ترقی کے حصول کے لیے اتنی بڑی قیمت چکانا نہ تو انفرادی سطح پر فرد کو اس آتا ہے اور نہ ہی اجتماعی سطح پر معاشرہ ہی اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ و کبھی کبھی میں سوچا کرتا ہوں کیا ترقی کی اس قدر قیمت ادا کرنا درست ہے؟ کیا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے قرضوں کی طرح معمولی انسان بھی صرف تبدیلی کی قسطیں ادا کرتافوت ہو جائے گا۔ نہ ترقی حاصل کر پائے گا، نہ فلاح ... نہ حال کی ترقی اس کی ہوگی، نہ مابعد کی ۔ ہم کیوں نہیں جان سکتے کہ انسان کلی طور پر کبھی بھی مادیت میں ضم نہیں ہوسکتا۔ غالباً یہ مشیت کی منشا بھی نہیں ۔"(3)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ انفرادی سطح پر فرد کے کردار کی تعمیر وتشکیل اور اجتماعی سطح پر معاشرتی توازن و استحکام اور ترقی میں اقدار اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناولوں میں جو کردار پیش کیے ہیں ان کے حوالے سے وہ کہتی ہیں کہ کردار کی عظمت اور زوال کا انحصار مثبت اقدار کی پختگی اور کمزوری پر ہے۔ ظفر کے کردار) شہر بے مثال (کے ذریعے بانو قدسیہ نے اخلاقی و روحانی اقدار کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ ایک مستحکم و متوازن شخصیت کا نمونہ ہمارے سامنے لا کر وہ یہ بتاتی ہیں کہ مثبت اقدار کا سہارا انسان کو ہر طوفان سے نپٹنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ اس کی پختہ اقدار کسی خوف اور دباؤ کو قبول کیے بغیر اس کے ارادوں کو مضبوطی اور حوصلوں کو بلندی عطا کرتی رہیں۔ اپنی اقدار پر اس کا ایمان ہی اس کے استقلال کا باعث بنا۔ اس کردار کے ذریعے بانو قدسیہ یہ پیغام دیتی ہیں کہ اخلاقی اقدار کی بنیادیں اگر پختہ ہوں تو وہ ذات کو کلیت عطا کر کے اسے رفعتوں سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ ظفر کی اقدار نے اسے جو صراط مستقیم دکھایا اس پر چل کر وہ ذہنی وروحانی ارتقاء حاصل کرتا ہے۔

بانو قدسیہ کا ظفر کی نسبت عظیم ہستیوں سے قائم کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اخلاقی قدریں ہی وہ معیار ہیں جن پر کردار کی عظمت کو پرکھا جا سکتا ہے۔ رشو کے کردار کے ذریعے بانوقدسیہ نے کردار کی نا پائیداری اور بودے پن کے نتائج کو بیان کیا ہے۔ اقدار کی ناپختگی نے رشو کے رویوں

اور رجحانات کو نا ہموار بنا دیا تھا۔ مذبذب اخلاقی اقدار کی وجہ سے وہ قوتِ فیصلہ اور ارادوں کی استقامت سے محروم ہو چکی تھی۔ رشو کے کردار کے حوالے سے بانو قدسیہ تصادم قدر سے جنم لینے والی ذہنی و روحانی ٹوٹ پھوٹ کے اثرات کو بیان کرتی ہیں۔ رشو کی ذہنی و نفسیاتی کشمکش نے اسے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ schizophrenia کی مریضہ بن جاتی ہے۔ اپنی اقدار سے کٹ جانے کی سزا اسے معاشرتی تنہائی، پچھتاوے اور نفسیاتی بیماریوں کی صورت میں ملتی ہے۔ قیوم) راجہ گدھ (کو بانو قدسیہ نے روحانی و اخلاقی اقدار کے زوال کا استعارہ بنایا ہے۔ مردار خوری کو حرام مغل قرار دیتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ موجودہ عہد میں حرام اور حلال کا امتیاز ختم ہو کر مردار خوری انسانی فطرت کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ روح اور جسم دونوں کا حرام کھا رہا ہے اور نتیجے میں ذہنی و نفسیاتی بیماریوں کی دلدل میں دھنستا جارہا ہے۔ بانوقدسیہ رزق حرام کو انسان کی جسمانی و ذہنی اور روحانی پراگندگی کا سبب قرار دیتی ہیں ۔ وہ کہتی ہیں کہ موجودہ عہد میں انسانی روح کا اضطراب اور ذہنی و فکری انتشار اسی ایک منفی فعل کے اثرات ہیں۔

سیمی کی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کو وہ شکستہ قدروں کا شاخسانہ قرار دیتی ہیں۔ سیمی بچپن سے محرومی کا شکار رہی ہے۔ اس کے خاندان کی منفی اقدار نے اس کی شخصیت کو غیر متوازن بنادیا تھا۔ لا حاصل آرزوؤں کے تعاقب میں وہ ساری زندگی بھٹکتی رہی ۔ بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ لا حاصلآرزوؤں کے حصول کے لیے انسان ہمیشہ غلط راستوں کا انتخاب کرتا ہے، یہی غلط راستے اس سے غلط اور صحیح کی تمیز بھی چھین لیتے ہیں ۔

سیمی اور قیوم کا ناجائز جسمانی تعلق سیمی کی محبت کے لیے تڑپ اور اس شدید جذبے کے سامنے ساری اخلاقی اقدار کو بھلا دینا، عابدہ کا نیچے کی خواہش میں قیوم کے ساتھ حرام تعلق اور امتل کی ساری زندگی مردار خوری کی کہانیاں ہیں ۔ راجہ گدھ کے کم و بیش تمام کردار حرام فعل کے مرتکب ہوئے۔ ان سب کی زندگیوں میں اضطراب، بے چینی ، تنہائی، فکری انتشار اور روحانی کرب اسی منفی قدر کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ عشق لاحاصل، لامتناہی نجس اور موت کی آگہی انسانیروح کے ایسے آزار ہیں جو ہمیشہ اسے کر بناک رکھتے ہیں۔ یہ تینوں انسانی ذہن کے ارتقاء اور شعور و آگہی کے باعث بن سکتے ہیں لیکن صرف اُسی صورت میں جب انسان روحانی واخلاقی اقدار کا حامل ہو۔ مصنفہ کہتی ہیں کہ منفی اقدار کی آمیزش سے انسانی قوتیں ہلاکت خیزی کی طرف مڑ جاتی ہیں۔ انسان یا تو اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے یا انسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔

''حاصل گھاٹ میں مصنفہ نے مشرقی اور مغربی اقدار کے تضاد کو دکھا کر بتایا ہے کہ مشرقی اقدار ، جو مذہب اور اخلاقیات سے اخذ کی گئی ہیں، انسان کے اندر مثبت خصائص کو جگا کر اس کے سیرت و کردار کو عظمتوں سے ہمکنار کرتی ہیں۔ حاصل گھاٹ کا مرکزی کردار صبر، اطاعت اور فرمانبرداری کی روحانی اقدار کو اپنا کر حقیقی مسرت اور راحت وسکون حاصل کرتا ہے۔

بانو قدسیہ حاصل گھاٹ میں روحانی واخلاقی اقدار اور مادی اقدار کا موازنہ کر کے انسانی شخصیت اور اس کی ذہنی و جذباتی زندگی پر ان کے اثرات کا تقابلی جائزہ لیتی ہیں۔ وہ ہمارے سامنے یہ نتیجہ رکھتی ہیں کہ مادیاقدار جو ترقی یافتہ معاشرے کی ضرورت بن چکے ہیں، انسان کو تنہائی سے دو چار کر کے اس کی جذباتی اور روحانی زندگی کو بنجر بنا رہی ہیں۔ بانو قدسیہ نے ہجرت کے حوالے سے اقدار کی شکست وریخت کے ایسے کو حاصل گھاٹ میں بیان کیا ہے۔ مصنفہ کا کہنا ہےکہ مشرق اپنی روحانی و اخلاقی اقدار کے حوالے سے احساس کمتری کا شکار ہو رہا ہے۔ امریکی معاشرہ جسے مادی ترقی کی علامت سمجھا جا رہا ہے، روحانی و اخلاقی قدروں سے دامن چھڑا کر مکمل طور پر مادی اقدار کو اپنا چکا ہے کیونکہ یہ ترقی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر تھا۔ مشرقی لوگ جب ترقی کی خاطر امریکہ کا رُخ کرتے ہیں تو ان کو اپنی اخلاقی اور مذہبی اقدار ترقی کے راستے میں حائل نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ اپنی سماجی اقدار کو اپنے لیے باعث شرم محسوس کرتے ہوئے جلد ہی ان سے چھٹکارا حاصل کرلیتے ہیں۔ وہ آزادی اور محنت کی قدر کو اپنا کر ترقی تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن جذباتی اور روحانی زندگی میں وہ تن تنہا رہ جاتے ہیں۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مشرقی باشندہ جب اپنی اقدار وروایات کو چھوڑ کر امریکی طرز زندگی کو اپنا لیتا ہے تو تبدیلی کا یہ عمل اس کے لیے زیادہ دیر تک خوشی کا باعث نہیں بن سکتا۔ کام کی خاطر اور آزادی کی طلب میں رشتے ناطے اور تعلقات ختم ہونے لگتے ہیں۔ انسان کے درمیان ذہنی و جذباتی فاصلے بڑھنے لگتے ہیں۔ اس کی زندگی میں محبت کا جو خلا پیدا ہو جاتا ہے اُسے پُر کرنے کے لیے وہ بے راہروی کا شکار ہوتا ہے۔ منشیات کا استعمال شروع کرتا ہے اور ہم جنسیت میں پناہ ڈھونڈ نے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن افسوس ، اسے کہیں بھی ذہنی آسودگی اور قلبی اطمینان حاصل نہیں ہوتا ۔

ہے۔ بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ فرد کے لیے اخلاقی و روحانی اقدار کو چھوڑ کر مادی اقدار اپنانے کا عمل خسارے کا باعث بنتا بانو قدسیہ فرد کے لیے حقیقی مسرت، راحت وسکون اور شانتی مذہبی اقدار میں تلاش کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ مذہب ہی انسان کی فلاح کا اصل راستہ ہے۔ روح کبھی بھی مادی ترقی کے راستے پر چل کر سکون اور مسرت کی منزل پر نہیں پہنچ سکتی ۔ بانو قدسیہ مذہبی اور روحانی اقدار کی طاقت کو تسلیم کرتی ہیں۔ راجہ گدھ میں وہ روحانی پہلوؤں کو سامنے لاتی ہیں۔ اور خدا کے فضل ، اس کی رحمت اور خاص عنایت کاذکر کرتی ہیں۔ وہ سیمی کے اندر کی کھڑکیوں کو کھلتے ہوئے دکھاتی ہیں اور آخر میں افراہیم کا کردار، روحانیت پر اُن کے اعتقاد کو ظاہر کرتا ہے۔

بانو قدسیہ راجہ گدھ ''میں جہاں انسان کو اخلاقی و روحانی پستیوں میں گرا ہوا دکھاتی ہیں وہاں وہ انسان کی روحانی بلندیوں کے امکانات کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ یہاں وہ انسان کی ظاہری تبدیلی کے عمل سے آگے بڑھ کر اس کی قلب ماہیت کو دکھاتی ہیں۔ سیمی کے عشق کی سچائی اور شدت اسے عرفان و آگہی کی منزلوں تک لے جاتی ہے۔ سیمی کے کردار سے مصنفہ اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ محبت کی مثبت قدر نے سیمی کے مثبت کرداری خصائص کو اُجا گر تو ضرور کیا لیکن اس کی منفی اقدار نے اس کی تمام خوبیوں کو نگل لیا۔ بانو قدسیہ عورت اور مرد کو مختلف اخلاقی اقدار کا امیں سمجھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ فطرتی و حیاتیاتی نقاضے سے عورت پرورش کی ضامن ہے اور مرد کفالت کا۔ جب عورت اپنے اس فطرتی اور حیاتیاتی مقصد اور فرض سے انحراف کرتی ہے تو اس کی روح نا آسودگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ جدید معاشرے کی عورت اپنے فطرتی مقصد کو بھلا کر اپنی شناخت کی تلاش کے سفر پر نکل کھڑی ہوئی ہے۔ وہ پرورش کی ضامن نہیں رہی، بلکہ آزادی کی طلبگار ہو چکی ہے۔ مصنفہ کہتی ہیں کہ آزادی کے نعرے نے عورت کے روایتی کردار کو سخت دھچکا پہنچایا ہے۔ اس نے آزادی تو حاصل کرلی ہے لیکن یہ اپنے ساتھ ذہنی دباؤ، فرسٹیشن اور ڈیپریشن جیسی بیماریاں لے کر آئی ہے۔ کیونکہ عورت اپنے فطری تقاضوں کو پورا کیے بغیر خوشی حاصل نہیں کر سکتی۔ دوسری طرف مرد نے کفالت کی ذمہ داری کو عورت کے ساتھ بانٹ لیا ہے۔ اس کی ذات کا فخر و غرور اور عزت و افتخار اس کے ساتھ ہی جاتے رہے ہیں۔ روحانیت اور اخلاقیات کے بنیادی اصولوں سے انحراف نے ان دونوں کے تشخص کو برباد کر دیا ہے۔ عورت میں اب وفا، ایثار و قربانی اور شفقت کی اقدار ختم ہوگئی ہیں اور مرد میں استقامت، جرات، ارادے کی پختگی اور کفالت کی اقدار عنقا ہوگئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان پائیدار تعلق کی اساس ختم ہو چکی ہے۔

بانوقدسیہ بجھتی ہیں کہ مذہبی اقدر کی طرف رجوع انسان کے مسائل کا بوجھ کم کر سکتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مذہب اور اخلاقیات نے عورت اور مرد کے لیے جو الگ الگ اقدار متعین کر دی ہیں، اسی میں ان کی فلاح کا تصور موجود ہے، اپنی اقدار کو اپنا کر وہ اطمینانِ قلب ، سکون اور شانتی پاسکتے ہیں۔

بانو قدسیہ محبت کو انسانیت کی سب سے بڑی قدر تسلیم کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ آج کا جدید عہد محبت کی بجائے آزادی کا طلب گار ہے۔ آزادی کی خواہش نے انسانی تعلقات میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ معاشرہ جس رفتار سے ترقی کی طرف بڑھ رہا ہوگا اُسی نسبت سے تعلق کا خاتمہ ہو رہا ہوگا۔ مادی ترقی کے ساتھ آزادی کی قدر روابستہ ہے اور روحانیت کے ساتھ محبت کی قدر پرورش پاتی ہے۔ محبت کی قدر نے ختم ہو کر ہوس کو جنم دیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو استعمال کر کے ٹشو پیپر کی طرح پھینک رہے ہیں۔ محبت کی اس کمی سے انسان کی روح پیاسی ہے۔ اسے کہیں سکھ چین نصیب نہیں ہورہا۔ تعلق کے خاتمے اور محبت کی کمی سے نفسیاتی امراض بڑھ رہے ہیں، منشیات کے استعمال ، خود کشی کی شرح، شکستہ خاندانوں کی تعداد اور جنسی بے راہروی میں اضافہ کا گراف دن بدن اونچاہو رہا ہے۔

بانو قدسیہ انسان کی حقیقی مسرت اور راحت وسکون کے لیے مادی ترقی کی بجائے فلاح کا راستہ تجویز کرتی ہیں۔ وہ مذہب کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں کو تسلیم کرتے ہوئے زندگی میں ان کی عملداری کے حق میں بھر پور دلائل اور تجزیوں سے کام لیتے ہوئے ہمارے سامنے یہ نتیجہ رکھتی ہیں کہ حقیقی تعلق ، جو سچی محبت سے پیدا ہوتا ہے، انسانی دُکھوں کا اصل مداوا ہے۔ لیکن یہ تعلق آزادی کو سلب کرنے والا نہیں بلکہ غلامی میں آزادی کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ صبر روحانی قوتوں کو تیز کرتا ہوا انسان کو حقیقی سکون اور اطمینانِ قلب سے مالا مال کرتا ہے۔

بانو قدسیہ اطاعت اور فرمانبرداری کو اعلیٰ اخلاقی قدر گردانتے ہوئے انسانی کردار کی تشکیل اور ذہنی تربیت میں اس کی ضرورت کو ناگزیر قرار دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ انسانی کردار کو روحانی سطح پر رفعتوں اور عظمتوں سے ہمکنار کر دینے والی سب سے بڑی قدر مان لینا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ اختیار کو منفی اور ابلیسی صفت قرار دیتی ہیں ۔ وہ کہتی ہیں کہ فیصلے کا اختیار انسان کو ذہنی و روحانی کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح لایل سوالات کی خاطر بے نشان منزلوں کا سفر انسانی روح کو تھکا دیتا ہے۔ وہ کہتی ہیں ایسی صورت میں جاننے کی بجائے ماننا روح کی آسودگی کا باعث بنتا ہے .وہ کہتی ہیں کہ جاننے سے پہلے حکم سن کر مان لینا ایسی روحانی صفت ہے جو انسان کو خدا کا محبوب بنا دیتی ہے۔ یہی صفت انسانی تعلقات کی استواری کا بھی واحد طریقہ ہے۔

بانو قدسیہ نے'' راجہ گدھ ''اور'' حاصل گھاٹ میں روحانی واخلاقی لحاظ سے زوال پذیر معاشروں کو موضوع بنایا ہے۔ راجہ گدھ ''میں پاکستانی معاشرہ اور حاصل گھاٹ میں امریکی معاشرے کی روحانی‌واخلاقی قدروں کے زوال کو بیان کرتی ہیں ۔ "راجہ گدھ ''میں وہ معاشرے کے پست تصویر اخلاق، طبقاتی امتیاز ، منافقانہ مذہبی اقدار پر کڑی تنقید کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں‌کہ جدید معاشرے میں محبت کی جگہ ہوس نے لے لی ہے۔ لوگ محبت طلب کرنے کی بجائے حقوق طلب کرنے لگے ہیں جس سے معاشرے میں نفسانفسی اور مفاد پرستی بڑھ رہی ہے۔ زوال پذیرشہری معاشرہ میں مادیت پرستی بڑھنے سے مذہب اور اخلاقیات کی حقیقی شکل بگڑ گئی ہے۔ معاشرہ تضادات کی لپیٹ میں ہے۔ ایسے معاشرے میں پرورش پانے والے افراد ذہنی کشمکش، تضادات اور فکری پراگندگی کا ورثہ حاصل کرتے ہیں۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ اعلیٰ تہذیبی و اخلاقی اقدارنئی نسل تک منتقل نہیں ہور ہیں۔ نتیجہ میں اقدار سے کٹ‌ایسی نسل سامنے آرہی ہے جو تخلیقی‌رویوں اور آدرشی زندگی کے نصب العین سے عاری ہے۔ یہ نسل معاشرے کی تعمیر میں فعال کردارادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مادہ پرست معاشرے کی سب سے بڑی منفی صفت حرص ہے۔ اس ایک حرص کی بنا پر معاشرہ کئی طرح کی اخلاقی برائیوں کا شکار ہو رہا ہے۔ حرص و ہوس نے آج کے انسان کو لا حاصل آرزوؤں اور خواہشوں کی تمنا میں دیوانہ بنا دیا ہے۔ وہ ان کے تعاقب میں ہر جائز و نا جائز راستے پرچلتا رہتا ہے۔ اس کی ہر قدر مادی ہو جاتی ہے۔ حرام اور حلال کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مردار خوری کی عادت ایسے معاشرے میں جڑ پکڑ لیتی ہے اور پھر مثبت عمل بھی منفی سمت اختیار کر لیتا ہے۔ ہلاکت خیزی ایسے معاشرے میں پروان چڑھتی ہے اور انسان خود ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیتا ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر معاشرے میں شکستہ خاندانوں کی تعداد بھی بڑھنے لگتی ہے۔ روایتی خاندانی اقدار کا زوال خاندانی اکائی کو بُری طرح متاثر کرتا ہے۔ ایسے خاندانوں میں پرورش پانے والے بچے ذہنی و نفسیاتی طور پر معذور ہو جاتے ہیں۔ سیمی '' ایک ایسا ہی کردار ہے جو شکستہ خاندانی زندگی کا شکار ہوا۔ وہ غیر متوازن شخصیت کے باعث خودکشی کی مرتکب ہوئی۔ وہ کہتی‌ہیں، اخلاقی لحاظ سے بنجر معاشرے میں پرورش پانے والے حساس اور ذہین انسان خود کو ذہنی و جسمانی شکست وریخت سے نہیں بچا سکتے۔

حاصل گھاٹ میں بانو قدسیہ مادی ترقی کے کمال پر پہنچے ہوئے امریکی معاشرے کی اخلاقی وروحانی سچ روی کو بے نقاب کرتی ہیں۔ یہ ناول مشرقی معاشرے کو خبر دار کرنے والی ایک آواز ہے۔ وہ مشرق کو تنبیہ کرتی ہیں کہ اگر انہوں نے مادی ترقی کی خاطر اپنی اخلاقی دروحانی اقدار کو نظر انداز کر دیا تواس کا انجام بہت بھیانک ہوگا‌ہے۔

وہ کہتی ہیں کہ مادی ترقی کے حصول کی خاطر کی گئی ہجرت کا حاصل گھاٹ ہمیشہ تنہائی اور پچھتاوے کا روگ ہوتا حاصل گھاٹ خبر دار کرنے والی آواز کے ساتھ فلاح کی طرف بلاوا بھی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مغربی اور امریکی معاشرہ مادی ترقی کی خواہش میں روحانی و اخلاقی قدروں کو روندتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ اب اس کی ہر قد ر مادی ہو چکی ہے۔ زندگی کی رفتار تیز ہو جانے کے بعد اپنی من مانی کو شعار زندگی بنا کر محبت، وفاءایثار وقربانی، درگزر اور شرم و حیا جیسی اقداروہ ترک کر چکے ہیں۔ اگر مشرقی معاشرہ بھی‌مادی ترقی کی خاطران کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے تو اسے اپنے طرزفکر واحساس، نظام زندگی، تہذیب و ثقافت اور اقدار وروایات کی قربانی دینا پڑے گی۔ لیکن اسے علم ہونا چاہیے کہ اپنا تشخص کھو کر وہ بھی بھی روحانی

وقلبی سکون حاصل نہیں کر سکے گا اور دوسری طرف جس مادی ترقی کو وہ حاصل کرے گا وہ بھی ادھوری ہوگی۔ مذہب اور اخلاقیات کی ہر قید سے آزاد مادی ترقی اس کی روح کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ فطرتا مکمل طور پر مادیت میں ضم نہیں ہوسکتی۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ انسان کی اصل تلاش ، اطمینانِ قلب ، سکون اور شانتی کے لیے ہے لیکن یہ اس کی بھول ہے کہ وہ اسے مادی ترقی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مادی ترقی کو رد کرتے ہوئے روحانی ترقی کو شرف انسانیت سمجھتے ہوئے ، اس طرف دھیان دینے کی تلقین کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ فلاح کا راستہ ہی انسان کو اطمینانِ قلب اور راحت وسکون کی منزل پر لے جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہبی احکامات کو سر جھکا کر مان لینے اور صبر سے راضی برضا ہونے میں ہی انسان کی فلاح پوشیدہ ہے۔ وہ اسے فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی قرار دیتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بانو قدسیہ انسانیت کی فلاح کے لیے مادی ترقی کو یکسر تر دکر کے مذہب اور روحانیت کی طرف رجوع کرتے ہوئے مذہب کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتی ہیں جو دنیاوی ترقی کے لیے انسانی کوششوں کی رہنمائی کر کے اسے مادی ترقی پر ابھارتے ہیں۔

وہ اختیار کو ابلیسی صفت قرار دے کر اسے مطلق منفی قدر قرار دے دیتی ہیں۔ وہ ذہنی ارتقاء اور کردار کی پختگی میں اختیار کی مثبت اہمیت کو بالکل نظر انداز کر کے مجہولیت کا درس دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بانو قدسیہ ذہنی آزادی سے انکار کرتی ہیں جس سے دانشورانہ فضا میں گھٹن پیدا ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ وہ بزرگی کو ذہانت پر ترجیح دیتی ہیں۔ حالانکہ جتنی بھی ذہنی علمی اور سائنسی ترقی ہوتی ہے اس کی بنیاد اس وقت تک کے موجود تمام علم کی نفی یا جز دی نفی پر ہوتی ہے۔ وہ حضرت آدم اور ابلیس کی کہانی سے فلسفہ اختیار کی منفی حیثیت تو اخذ کرتی ہیں لیکن ابلیس کے انکار کی مثبت اہمیت کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ بانو قدسیہ پرکھوں اور بزرگوں کی عقل، علم اور تجربے کے سامنے مان لینے کی قدر کو اہمیت دے کر تخلیقی فکر اور ذہنی اپج کا راستہ بند کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ رزق حرام کی تھیوری پیش کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ رزق حرام جب ایک دفعہ انسانی جینز کومتاثر کر دیتا ہے تو پھر اس کے اثرات نسل در نسل چلتے ہیں۔ یہاں وہ منفی قدروں کے اثرات کو مثبت قدروں کی قوت پر حاوی ہوتے ہوئے دکھاتی ہیں ۔ اور انسان کے انفرادی اعمال کو ثانوی حیثیت دے دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں باپ دادا کے گناہوں کی سزا کسی معصوم کو مل سکتی ہے۔

بانو قدسیہ جینز کی Mutation کا نظریہ تو پیش کرتی ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں وہ کوئی ایسا نسخہ تجویز نہیں کرتیں جو مذہب اور روحانیت کے تناظر میں، انسانی نسلوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے نسل انسانی کو رزق حرام کے اثرات سے باہر نکال سکے۔ اس کے برعکس وہ افراہیم) راجہ گدھ (کا کردار سامنے لاتی ہیں، جس کے باعث روحانیت کی طرف ان کا جھکا و عمل کی معنویت کو ختم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

حاصل گھاٹ میں بانو قدسیہ مثالیت کا شکار نظر آتی ہیں۔ وہ مشرق میں سب اچھا ہے، کے فلسفے کا پرچار کرتے ہوئے مغربی فکر، طرز احساس اور اقدار و روایات کو مادی کہہ کر اخلاقی زوال کا باعث قرار دیتی ہیں۔ وہ مشرقی فکر کی اس حد تک پرستار ہیں کہ معاشرتی انصاف، مساوات اور انسانی ہمدردی جیسی قابل قدر اقدار کو بھی یہ کہہ کر درخور اعتنا نہیں سمجھتیں کہ ان کی بنیاد شخصی محبت کی بجائے غیر شخصی ہمدردی اور مفاد پرستی پر مبنی ہے۔

وہ اطاعت و فرمانبرداری کی تلقین کرتے ہوئے اس کے منفی پہلوؤں سے آنکھ بچا جاتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مشرق کے اکثر ممالک میں زندگی کا رویہ آمرانہ اور حاکمانہ ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ جابرانہ شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے پس پشت وہ مشرقی طرز فکر ہے جس میں ہمیشہ اطاعت کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہ اطاعت خدا سے شروع ہو کر حاکم وقت تک کے لیے درست سمجھی جاتی ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان باپ ، شوہر اور بزرگوں کی اطاعت کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ مشرقی فلسفہ فکر میں بزرگوں اور پرکھوں کی عقل، علم اور تجربے کی نفی سے روکا جاتا ہے۔ بانو قدسیہ بھی اسی فکر کو اپنے ناول میں جگہ دیتی ہیں۔ وہ جانے سے پہلے مان لینے کو افضل ترین رویہ بجھتی ہیں ۔ لیکن اس میں یہ قباحت نظر آتی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کسی سوچ اور نظام کی پابندی کرنا اور اس کے سامنے سر جھکا دینا تخلیقی فکر اور ذہنی اپج کی راہیں مسدود کرنے کے مترادف ہوگا۔

بانوقدسیہ کی فکر پر خانقاہی فکروفلسفہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کے متوازن ارتقاء کا تصور موہوم ہے۔ وہ روحانی ارتقاء کی تبلیغ کرتےہوئے مادی ترقی کو جملہ گناہوں میں شمار کر لیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاں مادہ و روح اور مشرق و مغرب کے امتزاج سے تخلیق پانے والی تو انا زندگی کی روح نظر نہیں آتی۔

بانو قدسیہ فلاح و ترقی کے ملاپ سے جنم لیتا ہوا کوئی ایسا متوازن نقطۂ نظر سامنے نہیں لاتیں جو مشرق کے مادی زوال اور فکری پس ماندگی کو کم کر کے ، روحانی اقدار کے ساتھ مادی ترقی کی منزل کی طرف بڑھنے کے لیے بالغ نظری اورعزم و حوصلہ عطا کر سکے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فلاح اور ترقی کے درمیان کوئی وسطی راستہ موجود ہے؟ کیا انسان اس دنیا میں تضادات کے درمیان پنڈولم کی طرح ہی گھومتا رہے گا؟ وہ تضاد جو اس کی ذات میں روزِ ازل رکھ دیا گیا تھا، کیا اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ موجود ہے؟ اس دنیا میں انسان کی ساری تگ و دو، اس کی فکری کاوشیں، صوفی نظریات، فلسفیانہ موشگافیاں اور مذہبی نظام فکر ، اسی دوئی کے تضاد کو حل کر کے ابدی خوشی کی تلاش کا سفر ہے۔ بانو قدسیہ بھیاسی راستے کی ایک مسافر ہیں۔

مجموعی طور پر بانو قدسیہ کی فکر کا احاطہ کیا جائے تو ایک بڑےلکھاری کی طرح زندگی، معاشرے اور اقدار کے بارے میں ان کے ہر ناول میں غور وفکر کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کے ہاں تلاش کا سفر بھی موجود ہے اور عرفان و آگہی کی منزلیں بھی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے فکری اور قلبی تجربے سے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں جن سے اختلاف و اتفاق کی دونوں‌صورتیں موجود ہیں اور ایک بڑے فن پارے میں یہ دونوں موجود رہتی ہیں جو اس کی ہمہ جہتی کا ثبوت ہوتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ شہر بے مثال ، لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ ء ،ص ۱۲۳-۱۲۴

۲۔ بانوقدسیہ حاصل گھاٹ، لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۲۰ء ، ص ۱۳۱-۱۳۲

۳۔ ایضاً،ص ۱۳۲